حکم و عبر

ڈاکٹر اسرار احمد

قرآن کا قانونِ عذاب

ہمارا ایمان ہے کہ اس کائنات میں ایک پتہ بھی اللہ کے اذن کے بغیر جنبش نہیں کر سکتا۔ ساتھ ہی ہمیں یہ بھی پورے یقین کے ساتھ معلوم ہے کہ یہاں جو کچھ ہوتا ہے اللہ کے ان اٹل قوانین اور قواعد و ضوابط یعنی قرآن حکیم کی اصطلاح میں اللہ کی اس "سنت" کے تحت ہوتا ہے جس میں کوئی تغیر و تبدل ممکن نہیں۔ جیسے کہ فرمایا سورۃ الاحزاب کی آیت ۶۲ میں کہ:

وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا ○

"تم ہرگز نہ پاؤ گے اللہ کی سنت میں کوئی تبدیلی!"

بعینہٖ یہی مضمون سورۂ فاطر کی آیت ۴۳ اور سورۃ الفتح کی آیت ۲۳ میں بھی وارد ہوا ہے ____ لہٰذا اگر آج پوری دنیا میں مسلمان شدید مصائب اور آلام سے دوچار ہیں تو یہ بھی یقیناً اللہ تعالیٰ کے کسی قانون یعنی اس کی اٹل اور مستقل سنّت کے تحت ہو رہا ہے۔ اور اگر ہم دل سے چاہتے ہیں کہ یہ صورت حال تبدیل ہو تو لازم ہے کہ قرآن حکیم پر تدبر اور تفکر کے ذریعے اللہ کے قانونِ عذاب کو سمجھنے کی کوشش کریں' اس لئے کہ اسی پر اصلاحِ احوال کی صحیح اور مؤثر تدابیر کے فہم و شعور کا انحصار اور دار و مدار ہے۔

قرآن حکیم کے عام اسلوب کے مطابق اس کا "قانونِ عذاب" بھی کہیں پورے کا پورا یکجا بیان نہیں ہوا ہے۔ بلکہ اس کی مختلف دفعات متفرق طور پر مختلف مقامات پر وارد ہوئی ہیں۔ اور اگر ان سب کو جمع اور مرتّب کر کے ان کی پشت پر کارفرما حکمت سمیت بیان کرنے کی کوشش کی جائے تو بات کچھ یوں بنتی ہے کہ:

(ا) یہ دنیا بنیادی طور پر دارالعذاب نہیں دارالامتحان ہے' اور جزاوسزا کا معاملہ اصلاً دنیا سے نہیں آخرت سے متعلق ہے۔ چنانچہ اس حیاتِ انسانی میں سے جو' علامہ اقبال کے اس قول کے مطابق کہ۔

"تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں' پیہم دواں' ہردم جواں ہے زندگی"

اتنی طویل ہے کہ دنوں' مہینوں اور سالوں کیا صدیوں میں بھی نہیں ناپی جا سکتی' موت کا ایک وقفہ ڈال کر (۔ "موت اِک زندگی کا وقفہ ہے۔ یعنی آگے بڑھیں گے دم لے کر!") جو نہایت مختصر اور حقیر سا حصہ "حیاتِ دنیوی" کی صورت میں علیحدہ کر لیا گیا ہے' اس کی اصل غرض و غایت آزمائش اور امتحان و ابتلا ہے۔ جیسے کہ فرمایا گیا سورۃ الملک کی آیت ۲ میں کہ:

خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا

"اس نے بنائی موت اور زندگی تاکہ تمہیں آزمائے کہ کون ہے تم میں سے اچھے عمل کرنے والا!"

جس کی بہترین ترجمانی کی ہے علامہ اقبال نے اپنے اس شعر میں کہ:۔

"قلزمِ ہستی سے تو ابھرا ہے مانندِ حباب
اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی!"

اس امتحان میں انسان کی کامیابی یا ناکامی کا فیصلہ قیامت کے دن ہو گا' جہاں اگرچہ اس غرض کے لئے تو قوموں اور امتوں کی اجتماعی پیشی بھی ہو گی کہ ان کی جانب مبعوث کئے جانے والے رسول استغاثے کے گواہوں کی حیثیت سے ان پر حجت قائم کر سکیں کہ ہم نے تو تمہیں اللہ کا پیغام پہنچانے کا حق ادا کر دیا تھا' اب اپنے طرزِ عمل کے لئے تم خود جوابدہ ہو' تاہم اصل محاسبہ ہر انسان کا خالص انفرادی حیثیت پر ہو گا جیسے کہ فرمایا سورۂ مریم کی آیت ۹۵ میں کہ:

وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا۝

"ان میں سے ہر شخص قیامت کے دن اللہ کے حضور میں پیش ہو گا فردا فردا یعنی اکیلا اکیلا!"

گویا انفرادی سطح پر کسی انسان پر جو مصیبتیں حیاتِ دنیوی کے دوران نازل ہوتی ہیں وہ امتحان اور آزمائش کی غرض سے ہوتی ہیں' عذاب یا سزا کے طور نہیں۔ اس قاعدۂ کلیہ میں صرف ایک استثناء' جو بعض احادیثِ نبویہؐ سے معلوم ہوتا ہے' یہ ہے کہ بعض اوقات اللہ تعالیٰ اپنے کسی نیک اور مقبول بندے کو دنیا میں کسی تکلیف میں اس لئے مبتلا کر دیتا ہے کہ اسے اس کی کسی خطا کا کفارہ بنا دے' تاکہ وہ آخرت کی سزا سے بچ جائے۔ تاہم منطق کے عام قاعدے کے مطابق اس استثناء سے قاعدۂ کلیہ ختم نہیں ہوتا!

(۲) البتہ اس قاعدۂ کلیہ کا کامل اطلاق صرف افراد پر انفرادی حیثیت سے ہوتا ہے۔ قوموں اور امتوں کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ ان کی اجتماعی غلط روی اور مجموعی بداعمالی کی سزا اکثر و بیشتر اس دنیا میں دے دی جاتی ہے۔ چنانچہ بالکل صحیح فرمایا ہے علامہ اقبال نے کہ۔

"فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
نہیں کرتی کبھی مِلّت کے گناہوں کو معاف!"

اور قوموں اور امتوں پر وارد ہونے والے اس اجتماعی عذاب کا تلخ ترین پہلو یہ ہے کہ اس میں گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے۔ یعنی گناہ گاروں کے ساتھ ساتھ بے گناہ بھی عذاب کا نوالہ بن جاتے ہیں۔ جیسے فرمایا سورۃ الانفال کی آیت ۲۵ میں کہ:

وَاتَّقُوا فِتْنَةً لَّا تُصِيبَنَّ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنكُمْ خَاصَّةً ۖ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ۝

"اور ڈرو اس وبال سے جو تم میں سے صرف ظالموں ہی کو لاحق نہیں ہو گا!
اور جان رکھو کہ اللہ سزا دینے میں بہت سخت ہے!"

اگرچہ اس میں بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے خصوصی فضل و کرم سے ایک استثناء کی امید

دلائی ہے یعنی یہ کہ کسی قوم یا امت پر وارد ہونے والے اجتماعی عذاب سے ان لوگوں کے بچنے کی امید کی جا سکتی ہے جو نہ صرف یہ کہ خود بدی سے اجتناب کرتے رہیں بلکہ اپنی قوم کو غلط روش اور اللہ کی معصیت اور نافرمانی سے روکنے میں ایڑی چوٹی کا زور صرف کر دیں جیسے کہ سورۃ الاعراف میں اصحاب السبت پر نازل ہونے والے عذاب کے ضمن میں فرمایا:

اَنۡجَیۡنَا الَّذِیۡنَ یَنۡهَوۡنَ عَنِ السُّوۡٓءِ (آیت ۱۶۵)

"اور ہم نے بچا لیا ان لوگوں کو جو بدی سے روکتے رہے تھے!"

(۳) قوموں اور امتوں پر دنیا میں نازل ہونے والے عذاب کی بدترین اور شدید ترین صورت وہ ہے جس سے وہ قومیں دوچار ہوئیں جن کی جانب اللہ نے اپنے رسولوں کو مبعوث فرمایا اور انہوں نے ان پر اپنی دعوت و تبلیغ میں سعیِ بلیغ فرما کر اور حق کی قولی و عملی شہادت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ رکھ کر اتمامِ حجت کا حق ادا کر دیا۔ اس کے باوجود ان کی قوموں نے بحیثیتِ مجموعی ان کی دعوت کو رد کر دیا اور حق کی راہ اختیار نہ کی تو ان پر "عذابِ استیصال" نازل ہوا۔ یعنی صرف رسولوں اور ان معدودے چند لوگوں کو بچا کر جو ان پر ایمان لائے' باقی پوری پوری قوموں کی جڑ کاٹ ڈالی گئی یعنی انہیں نیست و نابود اور نسیًا منسیًا کر دیا گیا۔ چنانچہ قرآن کا ہر قاری بخوبی واقف ہے کہ اسی عذابِ استیصال یا عذابِ اکبر کی مثالیں ہیں وہ عذاب جو قومِ نوحؑ، قومِ صالحؑ، قومِ لوطؑ، قومِ شعیبؑ اور آلِ فرعون پر نازل ہوئے جن کے نتیجے میں کہیں تو ارشاد ہوتا ہے کہ **کَاَنۡ لَّمۡ یَغۡنَوۡا فِیۡهَا** "وہ ایسے ہو گئے جیسے کبھی تھے ہی نہیں!" (سورۂ ھود: ۶۸ اور ۹۵) کہیں فرمایا گیا کہ اب **لَا یُرٰۤی اِلَّا مَسٰکِنُهُمۡ** "ان کے مکانوں اور مسکنوں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا" (سورۃ الاحقاف: ۲۵) یعنی ان کے مکین نیست و نابود ہو گئے! اور کہیں ارشاد ہوتا ہے کہ: **فَقُطِعَ دَابِرُ الۡقَوۡمِ الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا** "ان ظالموں کی جڑ کاٹ ڈالی گئی" (سورۃ الانعام: ۴۵)

واضح رہے کہ اس نوع کے عذاب کے ضمن میں قرآن نے ایک سے زائد

مرتبہ وضاحت اور صراحت کی ہے کہ یہ کسی رسول کی بعثت کے ذریعے اتمامِ حجت کے بعد ہی نازل کیا جاتا ہے۔ چنانچہ سورۂ بنی اسرائیل میں اسی نوع کے عذاب کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ:

وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ○ (آیت ۱۵)

"اور ہم عذاب بھیجنے والے نہیں ہیں جب تک کسی رسول کو مبعوث نہ کر دیں"

اور سورۃ القصص کی آیت ۵۹ میں بھی یہی قاعدۂ کلیہ بیان ہوا ہے کہ:

وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى حَتّٰى يَبْعَثَ فِيْٓ اُمِّهَا رَسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا

"آپ کے رب کی شان یہ نہیں ہے کہ وہ بستیوں کو ہلاک کردے جب تک ان کے مرکزی مقام پر ایک رسول نہ بھیج دے جو انہیں ہماری آیات سنا دے!"

اس عذابِ استیصال، یا عذابِ اکبر کے ضمن میں اللہ کی یہ سنت بھی قرآن میں بار بار بیان ہوئی ہے کہ جس قوم کی جانب اللہ تعالیٰ رسول کو مبعوث فرماتا تھا اس پر آخری اور بڑے عذاب سے قبل چھوٹے چھوٹے عذاب لوگوں کو جھنجوڑنے کی غرض سے نازل فرماتا تھا تاکہ جو جاگ سکتے ہوں جاگ جائیں اور جن میں اصلاح پذیری کا مادہ موجود ہو وہ اپنی اصلاح کرلیں۔ چنانچہ اسی سنتِ الٰہی کا ذکر ہے اختصار کے ساتھ سورۃ السجدہ کی آیت ۲۱ میں:

وَلَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ○

"اور ہم انہیں لازماً مزہ چکھائیں گے چھوٹے عذاب کا بڑے عذاب سے قبل، شاید کہ یہ رجوع کرلیں!"

اور اسی کا تفصیلاً ذکر ہے سورۃ الانعام کی آیات ۴۱ تا ۴۵ اور سورۃ الاعراف کی آیات ۹۴ تا ۹۶ میں!

(۴) قوموں اور امتوں پر بحیثیت اجتماعی اس دنیا ہی میں نازل ہونے والے

عذابِ الٰہی کی دوسری قسم وہ ہے جو رسولوں کی امتوں پر ان کی غلط روی اور بداعمالی کے باعث نازل ہوتا ہے۔ یہ عذاب مقدم الذکر عذابِ استیصال سے اس اعتبار سے تو ہلکا ہوتا ہے کہ اس کے ذریعے قوموں یا امتوں کا بالکل خاتمہ نہیں ہوتا۔ لیکن اس اعتبار سے زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے کہ یہ وقفہ وقفہ سے مسلسل آتا رہتا ہے۔ اور جب کوئی مسلمان امت اس نوع کے عذاب میں مبتلا ہوتی ہے تو اس پر جو کیفیت طاری ہو جاتی ہے اسے منفی طور پر بیان کیا جائے تو وہ اس جہنمی انسان کی سی ہوتی ہے جو قرآن کے الفاظ میں "**ثُمَّ لَا یَمُوْتُ فِیْھَا وَلَا یَحْیٰی**" کا مصداق ہو جاتا ہے یعنی "نہ وہ زندہ ہی رہتا ہے' نہ اسے موت آتی ہے"۔ اور اگر اسے مثبت طور پر بیان کیا جائے تو یوں کیا جا سکتا ہے کہ ع "زندگی نام ہے مر مر کے جئے جانے کا!"

اس قسم کے عذاب کا اصل سبب یہ ہوتا ہے کہ جو قوم کسی رسول اور خاص طور پر کسی صاحبِ کتاب و شریعت رسول کی امت ہونے کی مدعی ہوتی ہے وہ گویا زمین پر اللہ کی نمائندہ ہونے کی دعویدار ہوتی ہے۔ اب اگر اس کا طرزِ عمل اور رویّہ اس کے دعوے کے برعکس ہو' اور وہ اپنے انفرادی اخلاق و اعمال اور سیرت و کردار اور اپنی اجتماعی تہذیب و ثقافت اور معاشی و سیاسی نظام میں کتابِ الٰہی کی تعلیمات اور شریعتِ خداوندی کے احکام سے مختلف ہی نہیں متضاد نقشہ پیش کرے تو یہ جرم ناقابلِ معافی ہے' اس لئے کہ اپنے اس طرزِ عمل کے باعث یہ نام نہاد مسلمان امت بجائے اس کے کہ خلق اور خالق کے مابین واسطہ (امتِ وَسَط) اور رابطے کا ذریعہ بنے' الٹی حجاب اور رکاوٹ بن جاتی ہے اور اس کو دیکھ کر اللہ کے بندے اللہ کے دین کی جانب راغب ہونے کی بجائے الٹے اس سے متنفر ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سورۃ الصف کی آیات ۲' ۳ میں فرمایا گیا:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ○ کَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰہِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ○

"اے ایمان کے دعویدارو! کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں؟ تمہارا یہ طرزِ عمل

کہ جو زبان سے دعویٰ کرو اس پر عمل میں پورے نہ اترو اللہ کے غضب کو
بہت بھڑکانے والا ہے!"

اس نوع کے اجتماعی عذاب میں مبتلا ہونے والی اقوام یا امتوں کا ایک وصفِ مشترک' جسے قسمت کی ستم ظریفی ہی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے' یہ ہے کہ وہ اس زعم میں مبتلا ہو جاتی ہیں کہ ہم تو اللہ کے بہت چہیتے اور لاڈلے ہیں' اور ہمارا معاملہ دوسرے عام لوگوں کا سا نہیں ہے بلکہ ہم اللہ کے یہاں خصوصی اور ترجیحی سلوک کے مستحق ہیں۔ اور ستم بالائے ستم یہ کہ اس جہلِ مرکّب میں مبتلا قوم پر جیسے جیسے عذابِ الٰہی کے کوڑوں کی شدت بڑھتی جاتی ہے اس کے متذکرہ بالا زعم میں بھی اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ گویا صورت یہ بن جاتی ہے کہ ادھر دُرے پر دُرہ پڑتا جاتا ہے' اور ادھر غَرہ پر غَرہ بڑھتا چلا جاتا ہے۔ چنانچہ اس کی کلاسیکل مثال ہے سابقہ امتِ مسلمہ یعنی یہود اور نصاریٰ کا یہ قول جو سورۃ المائدہ کی آیت ۱۸ میں نقل ہوا ہے کہ:

نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَ اَحِبَّآؤُهٗ

"ہم تو اللہ کے بیٹے ہیں' اور اس کے نہایت چہیتے اور لاڈلے!"

جس پر اللہ تعالیٰ نے نہایت عبرت انگیز تبصرہ فرمایا:

قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ

"اے نبیؐ ان سے کہئے کہ پھر اللہ تم پر تمہارے گناہوں کی پاداش میں عذاب کیوں نازل فرماتا رہا ہے؟ تمہارے اس زعم کے برعکس تم بھی ویسے ہی انسان ہو جیسے دوسرے جو اللہ نے پیدا فرمائے!"

اسی طرح ان کا ایک مزعومہ عقیدہ یہ بھی تھا کہ:

لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً

"ہمیں تو (جہنم کی) آگ چھو ہی نہیں سکتی سوائے گنتی کے چند دنوں کے!"

جس پر نہایت فصیح و بلیغ تبصرہ وارد ہوا:

قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗۤ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَالَا تَعْلَمُوْنَ ○ (البقرہ آیت ۸۰)

"اے نبیؐ ان سے پوچھئے کیا تم نے اللہ سے کوئی عہد لے رکھا ہے جس کے بارے میں تمہیں وثوق ہے کہ اللہ ہرگز اپنے اس عہد کی خلاف ورزی نہیں کرے گا؟ یا تم بغیر کسی علم کے اللہ کی جانب غلط باتیں منسوب کر رہے ہو؟"

اس نوع کے اجتماعی عذاب کے بارے میں یہ قاعدۂ کلیہ بھی بہت اہمیت کا حامل ہے کہ ع "جن کے رتبے ہیں سوا' ان کی سوا مشکل ہے!" کے مطابق کسی امت کو جس قدر بلند درجۂ فضیلت حاصل ہوتا ہے اس کے غلط طرز عمل پر عذاب کی شدت بھی اتنی ہی زیادہ ہوتی ہے۔ چنانچہ اس کی بھی نہایت نمایاں مثال قرآن حکیم میں سابقہ امتِ مسلمہ یعنی یہود ہی کے ضمن میں وارد ہوئی ہے۔ یعنی ان پر عذابِ الٰہی کی شدت کے بیان کے لئے جو الفاظ سورۃ البقرہ کی آیت ۶۱ میں وارد ہوئے ہیں کہ:

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ

"ان پر ذلت اور مسکنت مسلط کر دی گئی اور وہ اللہ کے غضب میں گھر گئے!"

ان سے کچھ ہی قبل یہ آیتِ مبارکہ بھی وارد ہوئی ہے کہ:

يٰبَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِىَ الَّتِىْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّىْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ○ (البقرہ: ۴۷)

"اے بنی اسرائیل! ذرا یاد کرو میرے ان انعامات و احسانات کو جو میں نے تم پر کئے۔ اور میں نے تو تمہیں تمام جہان والوں پر فضیلت عطا فرما دی تھی!"

پھر یہی معاملہ کسی مسلمان امت کے مختلف طبقات کا ہے کہ ان میں سے جسے جتنی زیادہ فضیلت حاصل ہوتی ہے' اتنی ہی زیادہ اس کی ذمہ داری بھی ہوتی ہے' اور غیر ذمہ دارانہ طرز عمل کے نتیجے میں اتنی ہی سخت سزا بھی اسے ملتی ہے!

(۵) مندرجہ بالا مباحث سے یہ نتیجہ ازخود برآمد ہو جاتا ہے کہ جو قوم نہ کسی

رسول کی امت ہونے کی مدعی ہو نہ ہی اس کی جانب اس کی یادداشت اور معلوم و محفوظ تاریخ کی حد تک کوئی رسول مبعوث ہوا ہو اس کے عذاب و ثواب اور جزا و سزا کا سارا معاملہ آخرت سے متعلق ہے۔ حیاتِ دنیوی کی حد تک وہ حیوانات اور چرند و پرند کے مانند اور سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۲۰ "**كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ**" اور سورۃ الاحقاف کی آیت ۲۰ "**اَذْهَبْتُمْ طَيِّبٰتِكُمْ فِىْ حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا**" کے مطابق اللہ کی عطا اور جُود و سخا کے دستر خوان سے کھا پی سکتے ہیں' اور دنیا کی نعمتوں اور لذتوں سے متمتع ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ دنیا کی حد تک تو ان پر صرف سپنگلر کے فلسفۂ تاریخ کے مطابق اس قانونِ طبعی ہی کا اطلاق ہو گا کہ جیسے ہر فرد پیدا ہوتا ہے' پھر جوان ہوتا ہے' پھر بوڑھا ہو جاتا ہے اور پھر مر جاتا ہے ایسے ہی قومیں اور تہذیبیں بھی مختلف طبعی ادوار سے گذر کر بالآخر ختم ہو جاتی ہیں۔ رہا حیاتِ اخروی اور یومِ قیامت کے محاسبہ کا معاملہ تو وہ تو ہر فرد نوعِ بشر کا اپنے اپنے نظریات و عقائد اور اخلاق و اعمال کے اعتبار سے طے ہونا ہی ہے!

بقیہ: اسلامی ثقافت اور نوجوان نسل کا کردار

محنت (اس میں ہر قسم کی زبانی' مالی' قلمی اور بدنی کوشش اور محنت شامل ہے اور جہاد کی تمام قسمیں بھی یعنی جہاد بالنفس' جہاد بالشیطین' جہاد بالکفار' جہاد بالبغاۃ اور جہاد بالمبطلین)۔ اس نے تم کو پسند کیا اور دین میں تمہارے لئے کوئی تنگی اور مشکل نہیں رکھی۔ یہ ملت ہے تمہارے باپ ابراہیمؑ کی۔ اس نے تمہارا نام مسلمان رکھا ہے پہلے سے بھی اور اس قرآن میں بھی تاکہ رسولؐ تم پر گواہ ہو اور تم تمام بنی نوعِ انسان پر گواہ ہو جاؤ۔ سو قائم رکھو نماز اور زکوٰۃ ادا کرتے رہو اور اللہ کو مضبوط پکڑو (یعنی اللہ کے دین اسلام کو) وہ تمہارا مالک ہے۔ سو خوب مالک ہے اور خوب مددگار۔"